کی ہے مجھے غریب الوطن جان کر اور میں خواہ مخواہ جل بھن رہی ہوں ان پہ۔
ننکے منے ویمان کا تازہ ترین خط بھی اسے بھول چکا تھا۔ صرف ڈمپل کا خوف باقی
تھا۔ جو کہیں ڈمپل ناراض ہو گئی تو میں اسے کیسے مناؤں گی؟ بڑی دیر ڈمپل کے
متعلق سوچتی رہی۔ پھر اٹھی بتی جلائی۔ ڈمپل کا لحاف اس کے کٹے ہوئے بالوں
تک کیا۔ اور اپنے پلنگ پر آبیٹھی۔

شام کو وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔

کتنی معجوب نظروں نے کاسۂ التفات اس کی طرف بڑھایا تھا۔

اس پر ساڑھی واقعی بہت سجتی ہے۔ جسم کا ایک ایک خم اُبھر آتا ہے۔

شام کا میک اپ ابھی تک چہرے پر باقی تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر آئینے
کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں اس کا جسم بہت سڈول نظر آ رہا تھا۔
رشّو نے اپنے بال کھولے اور سٹول پر بیٹھ کر انہیں کنگھی کرنے لگی۔ آج اسے اپنے
کان لمبے نہیں لگ رہے تھے۔ بالوں کے ریشمی کوڑیالے کندھوں پر ساٹن کے
بلاؤز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر لپ سٹک کی نامعلوم سی لکیر
باقی تھی۔ آنکھوں میں پارے کی سی چمک تھی۔

پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ ڈمپل سے زیادہ خوبصورت ہے اور اگر وہ ڈمپل
کی طرح اپنے وجود کو سینت سنبھال کر رکھے تو چینی نقش ونگار کی طرح اس کا اثر
بڑا دیرپا اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے پوڈر کو لون

کی شیشی اٹھا کر سینے پر چھڑکی۔ ایک نگاہ ڈمپل پر ڈالی اور کھلے بال چھوڑ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹی۔

کہتے ہیں کہ ویسے تو ہندوستان میں ان گنت سانپ ہیں۔ گوکھرا، کریت، کوڑیالا لیکن مستی کی رت میں گوکھرا جسے انگریز لوگ کوبرا پکارتے ہیں کوڑیالوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور شنکر چور ناگ جنم لیتے ہیں۔ پترراج اور ودودھ راج ناگ کی دوغلی نسل سے بھی شنکر چور ناگ جنم لیتے ہیں۔ ان کے سروں پر عموماً گائے کے کھر کا سا سفید نشان نہیں ہوتا جیسا کہ گوکھرے کے پھن پر ہمیشہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ناگ اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کی مسموم سانس سے انسانی جسم میں ورم آجاتا ہے۔ اور ان کی پھنکار سے چرند پرند دور دور بھاگ گئے ہیں۔ سردی کی رت میں شنکر چور عموماً دھوپ سینکنے کو اونچے درختوں پر چڑھ کر سو رہتے ہیں جس درخت پر شنکر چور اس طرح بسرام کر رہا ہو۔ اس کے اوپر پرندوں کے غول شور مچاتے پھرتے ہیں۔ اور جانوروں کو اپنے شور سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس پیڑ پر شنکر چور دھوپ سینکتا ہے۔ مالدیوی سپیروں کو ایسے ناگ پکڑنے میں بڑی مہارت ہے۔ اور عموماً اس نسل کے سپیرے سندربن میں شنکر چور پکڑنے جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ سپیرے کی بین سن کر عام طور پر ایسا ناگ پھنکارتا اور غرّاتا ہے۔ اوّل تو اس کی آواز سے بزدل آدمی بھاگ جاتا ہے لیکن اگر مالدیوی سپیرا ہو تو ڈٹا رہتا ہے۔ ایسے میں سانپ درخت سے اترتا ہے۔ سپیروں کا کہنا ہے کہ شنکر چور کو پکڑنے کے لئے عموماً تین سپیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک وہ جو اس کا سر پکڑے دوسرا دم دبانے کے لئے اور تیسرے کو چاہیئے کہ ترنت ناگ کی گردبالے۔ ورنہ ایسا منہ زور سانپ عموماً ایک ہی جھٹکے میں سر اور دم چھڑا لیتا ہے....

اس رات رشتو کے احساسِ حسن نے ڈمپل کے میک اپ کے سامان کے ساتھ مل کر ایک ایسے شنکر چوڑ کو جنم دیا جس کی پھنکار سے چرند پرند بھاگیں۔ اور جس کی سانس اتنی مسموم کہ انسانی جسم پر ورم آجائے۔

اس شنکر چوڑ کا احساس سب سے پہلے ملک صاحب کو ہوا۔ وہ گھر لوٹے تو ان کے دائیں ہاتھ میں عجیب قسم کی دکھن تھی۔ جیسے پہلی بار شراب پی کر ہینگ اوور کی گرانی ہو۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو ظفر کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ انہوں نے پہلی بار خواہش کی کہ کاش یہ بتی اس وقت بجھی ہوتی تو بہتر تھا۔ ان کا معمول تھا کہ بتی جلی دیکھ کر وہ ظفر کے کمرے میں ضرور جاتے۔ اور اس سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹتے۔ ان باتوں کا اثر ان پر ہمیشہ خوشگوار ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ ظفر کے کمرے کی طرف جانے کی ہمّت اپنے میں نہ پاتے تھے۔ پہلے انہوں نے برٹرنڈ رسل پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر سگار جلا کر کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

تیسویں منزل کی تیسری کھڑکی میں رات کا تیسرا پہر آگیا اور نیند اُنسے کوسوں دور تھی!!

ان کے دل میں زندگی اس طرح جاگ اٹھی تھی جیسے سردیاں گذر جانے پر شہد

کی مکھیوں کا چھتہ اچانک جاندار ہو جاتا ہے جیسے قطب شمالی کا سفید ریچھ ایک صبح برف میں سے تھوتھنی نکال کر دیکھتا ہے تو سمندر پر برف کی تہ ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔۔ اور ساری برف میں درزیں پڑ جاتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ سمندر کی سطح سفید نہیں رہتی۔ کالے نیلے سرد پانیوں کا ریلا سفید خشکی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ان کے دل میں ایک بار پھر جینے پھولنے پھلنے کی تمنا آرڈو کے شگوفوں کی طرح راتوں رات سر نکال بیٹھی تھی۔

لیکن وہ تو اپنی زندگی ختم کر چکے تھے؟

وہ تو صرف اپنے بچوں میں زندہ تھے۔ اپنے بچوں کی خوشیوں میں عکسِ منعکس بن کر وقت کاٹ رہے تھے۔ ان کی کوئی منزل نہ تھی۔ سب راستے ان کے بچوں کی شاہراہیں تھیں۔

پھر یہ احساس کیسا تھا؟ یہ احساس کیوں تھا؟ اور اگر تھا تو اس احساس کا علاج کیا تھا؟

انھیں اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ تب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُن دِنوں اُن کی دوستی اپنی جماعت کے ایک ہندو لڑکے مدن سے تھی۔ مدن ان ہندوؤں میں سے تھا جو کہا کرتے ہیں کہ جرمن لوگ ہماری رگ وید کے تین صفحے چرا کر لے گئے اور ان ہی صفحوں کی بدولت ہٹلر نے ہوائی جہاز بنائے بم بنائے۔ کبھی کبھی جب کوئی اسے جھٹلانے کی کوشش کرتا تھا تو مدن بڑی تیکھی آواز میں کہتا

"کیوں اڑن کھٹولا اور کیا ہے۔ ہوائی جہاز ہی تو ہے۔ ہنومان جی بھلا کس چیز سے لڑے تھے راکھشوں کے ساتھ۔ بموں کے ساتھ اور کیا۔ ہنومان نے ساری لنکا نگری کس چیز سے جلائی تھی۔ ڈائنامائٹ سے اور کیا۔"

رگ وید سے اتنی عقیدت کے باوجود مدن کی دوستی مسجد کے پڑھے ہوئے بختیار سے بہت تھی۔ دونوں اس در میں جادو اور عورت سے بہت متاثر تھے۔ گو در اصل وہ ایک ہی چیز سے متاثر تھے اور وہ تھی عورت! لیکن جادو بھی ایک زینہ تھا عورت تک پہنچنے کا۔ اس لئے انہیں دونوں سے لگاؤ تھا۔

انھی دنوں جب وہ شکستہ چینی کو جوڑنے کے لئے بیضۂ مرغ کی سفیدی لئے لئے پھرتے تھے۔ اور کاغذ پر لکھ کر ان حروف کو اڑا دینے اور پھر واپس لانے کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں ان کی گلی میں جیبو نامی ایک لڑکی آکر اتری۔ یہ لڑکی میانوالی سے آئی تھی۔ قدبت کسی نوکیلی سانڈنی کا سا تھا۔ لیکن ان دونوں کو یہ قند کا پتلا نظر آئی۔ دونوں کی ٹھوڑی تک رال ٹپکنے لگی۔

اسی روز بختیار دارچینی کا باریک سفوف روٹی میں ملا کر مسجد کے پچھلی طرف کتوں کو کھلانے نکلا تھا۔ یہ اس کی ساتویں روٹی تھی۔ ہر بار وہ اماں سے روٹی مانگ کر اس میں دارچینی کا سفوف ملاتا۔ اور مسجد کے پچھواڑے چلا جاتا۔ یہاں دو خارش زدہ کتے مستقل طور پر رہائش پذیر تھے۔ وہ کوڑھی روٹی کھا کر پھر پڑ جاتے حالانکہ اسرار الہنود کی کتاب میں صاف لکھا تھا کہ ایسی روٹی کھاتے ہی کتا بے

اختیار ناچ اٹھتا ہے۔

جس وقت ساتویں روٹی خارش زدہ کتے کھا کر ایک دوسرے پر تھوتھنی رکھے لیٹ گئے تو مدن گلی کی طرف سے برآمد ہوا۔ بختیار کا موڈ شرارت پر آمادہ تھا۔

"چلو، ابھی چلو۔"

"تمہاری ساری کتابیں جھوٹی ہیں۔ کیا رگ وید کیا اسرار المنود۔۔۔"

"بکو مت۔۔"

"سات روٹیاں کھا چکے ہیں اور کم بخت ایک بھی نہیں ناچا۔۔"

"ادھر شیخ جی کے چوبارے میں ایک لڑکی آئی ہے۔"

"لڑکی؟"

"ہاں گوری چٹی ناک میں بڑی سی کیل ہے اور کچھ اور طرح بولتی ہے پنجابی رٹ رٹ کرکے۔"

"ہم تو ادھر نہیں جا سکتے۔۔"

یکے دم مدن کا چہرہ بھی اتر گیا۔ ابھی چند دن ہوئے انہوں نے شیخ جی کے ریشمی تانگے کے گھوڑے کی چال اپنے تجربوں سے سست کی تھی۔ سارے محلے میں ابھی تک اس کا چرچا عام تھا۔ اور گھر والوں نے انہیں شیخ جی کے مکان کی طرف جانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

"ہمارے گھر سے چوبارہ تو نظر آتا ہے۔۔۔ ہے نا؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے . . . چلو تمہارے چوبارے پر چلیں . . ."

مدن اور بختیار پتنگ اڑانے کے بہانے دوسری منزل پر پہنچے تو سامنے کے چوبارے میں میاں فرزان کی بیبو بیٹھی لکڑی کی چھوٹی کنگھی سر میں پھیر رہی تھی کبھی کبھی وہ انگوٹھے کے ناخن آپس میں ملا کر دبا بھی دیتی۔

"اس کے تو شاید جوئیں ہیں سر میں۔" بختیار نے ڈر کر کہا۔

"جوئیں؟ . . . واہ! اتنی خوبصورت لڑکی کے سر میں جوئیں کیسے ہو سکتی ہیں؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے . . ."

سوچ کر بات کیا کرو . . ."

بیبو ماتھے پر گھسیٹ کر کنگھی پھیرتی اور جوئیں مارتی رہی۔ دیر تک مدن یہ خونریز نظارہ دیکھنے کا مشغلہ رہا۔ پھر بختیار اور مدن بھائی جان کا چھوٹا آئینہ نیچے سے لے آئے۔ اب مسلسل بیبو پر سورج کا عکس ڈالنے کی مشق ہونے لگی۔

"مجھے دے آئینہ . . ."

"مجھے دے آئینہ . . . تم تو مٹی پہ عکس ڈال رہے ہو۔"

"تمہیں کیا پتہ ہے۔ یہ پتال جنتر کی طرح مشکل کام ہے۔ لا مجھے دے آئینہ . . ."

آپس میں بلیوں کی طرح جھگڑ جھگڑ کر جب آخر بیبو نامی لڑکی پر عکس بھی پڑا تو وہ سانڈنی کی دم بھری۔ چھوٹی سی تیل کی کٹوری، کنگھی اور دری اٹھا کر اندر چلی گئی۔ اس دن کے بعد اس نے کوٹھے پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن مدن موہن بڑا گنیا مجبر قسم کا لڑکا

تھا۔

"اس کا باپ یہاں گھی بیچنے آیا ہے۔"

"میاں والی سے یہاں گھی بیچنے آیا ہے۔"

"ہاں۔ کوئی حرج ہے اس میں۔۔۔"

"تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔"

کچھ دن کے بعد جب مدن کافی معلومات لے آیا۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ بیبو کی اس محلّے میں ایک چھوٹی سی سہیلی بن چکی ہے جس کی وساطت سے نامہ و پیام بھی جاری ہو سکتے ہیں تو ایک دن دوسری منزل کی برساتی میں بیٹھ کر مدن اور بختیار نے سنبل سفید، گیرو، رومی مصطگی ہموزن لے کر علیحدہ علیحدہ سرمہ کی طرح پیسی اور پھر اس کی لاجوردی سیاہی بنا کر ایک محبت نامہ دونوں کی طرف سے لکھا۔

اس محبت نامے کو پہنچانے سے پہلے انہیں معلوم ہوا کہ میانوالی کی بیبو کا باپ بہت سخت گیر، وحشی، بدّو قسم کا آدمی ہے۔ اور اونٹ کٹارے کی طرح سخت جان بھی ہے۔ اسی لئے پہلے انہوں نے چار آنے کا لالچ دے کر مٹی کو خط پہنچانے پر آمادہ کیا اور آٹھ آنے دے کر خط واپس لیا۔

اس خط کو واپس لینے کے بعد کئی دن یہی فکر رہی کہ نامہ پہنچائیں تو کیسے۔ بالآخر مدن ہی کہیں سے نسخہ لایا۔ اب گل سرخ کے عرق سے نامہ لکھا گیا۔ سوکھنے پر حروف

نقطی بھائی نہ دیتے تھے۔ اس طرح سادہ خط منّی کے ہاتھ بیبو کو بھیجا گیا۔ ادھر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تو دوسرے عرق لیموں میں پھٹکڑی حل کر کے خط لکھا۔ حروف پھر غائب ہو گئے اور سادہ ورق بمع چار آنے منّی کے حوالے کئے گئے۔

اسی طرح جب پورا ماہ ادھر سے سادہ صفحے جاتے رہے اور ادھر سے ماتھے تک ہاتھ بھی نہ آیا تو ایک دن عدنان بولا . . .

"اب میں سمجھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتی۔"

"کیا مطلب ؟"

"اسے سادہ کاغذ ملتا ہے۔"

"ہاں . . . پھر ؟ . . ."

"اور وہ حروف واپس لانے کا طریقہ نہیں جانتی۔"

"ہاں . . . یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔"

"کاش کسی طرح اس کو بتا سکتے کہ . . . کہ کاغذ کو آگ دکھانے پر تمام حروف باہر نکل آئیں گے۔"

"پھر اب کیا کریں . . ."

"تب کہیں وہ ہمارے خط جلا کر پڑھتی تو حروف نظر آتے۔"

"ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں اسے . . ."

"جو خط ہم نے آب نارنج سے لکھا تھا اسے اگر وہ دھوپ میں رکھ دیتی تو

بھی پڑھ سکتی تھی ہمارا خط۔"

"تو پھر تم نے نسخہ لکھا کیوں نہیں۔"

"چپ کرو۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں خواہ مخواہ بولتے جاتے ہو۔"

بختیار چپ ہو رہا لیکن سوچ وہ بھی رہا تھا۔ اگلا خط اس نے منی کی وساطت سے جو بھیجا تو اس میں حروف واپس لانے کے جملہ نسخے رقم تھے۔ اور چونکہ یہ خط صرف بختیار کی طرف سے تھا۔ اس لئے جب میانوالی کے اونٹ کٹارے کو حروف واپس لانے کی ترکیب معلوم ہو گئی تو اس نے خوب خوب خطوں کو آگ دکھائی اور وہ راز جو بیبو تک نہ پہنچ پایا تھا جناب گھی بیچنے والے کو معلوم ہو گیا۔ اور بختیار کی وہ گت بنی کہ اس کے بعد وہ بے حد گھنا لڑکا بن گیا۔

اب اسے علم تسخیر، جادو، کششِ جسمانی، اوروں کی نظروں سے خود کو غائب کر لینا، موکل کے توسط سے سب کو دیکھتے رہنا۔ اور خود نظروں سے اوجھل رہنا، جنات پر قابو، مسمریزم وغیرہ کا چسکا پڑ گیا۔ مدن موہن بہت بعد تک ڈنگیں مارتا رہا کہ اس کے تعلقات بیبو سے ہو چکے ہیں۔ لیکن بختیار کا اب اس کے ساتھ ایسی باتوں میں سانجھا نہ رہا تھا۔ اس کا اعتقاد رگ وید اور اسرار الہنود سے یکسر اٹھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مدن موہن وہ رشی منی ہے جو زبانی شیشے چباتا ہے۔ انگاروں پر چلتا ہے۔ کڑھائی سے بھنے ہوئے تیتر اڑا دیتا ہے۔۔۔۔ اندھیرے کمرے میں دیگ روشن کر دیتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے جسے دو روٹیاں

بہت کافی ہوتی ہیں۔ اور جس کا علم خود اس کا جسم بھی پالنے کے لئے کافی نہیں۔

بختیار اپنے کمرے میں گھنٹوں ایک نکتے پر آنکھیں مرکوز رکھتا اور اپنے میں قوتِ تسخیر پیدا کرتا۔ کئی موہنی منتر، کئی عمل، کئی وظیفے اس نے چوری چوری کیے لیکن گیدڑ میں شیر کی جوان مردی پیدا نہ ہوئی۔ یہ سبق انہوں نے زندگی میں بہت جلد سیکھ لیا کہ کچھ لوگوں سے عورتیں صرف اس لئے محبت کرتی ہیں کہ وہ مسمریزم نہیں جانتے، ... اور کچھ لوگوں سے عورتیں اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ مسمریزم جانتے ہیں!!

عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکال لیا تھا اس طریقے کے تحت مرد کا امیر ہونا بہت ضروری تھا۔

لیکن یہ تو بہت پہلے کی باتیں تھیں ... جب ملک صاحب جوان تھے۔ اتنے سال برف کے نیچے دبے رہنے کے باعث اب ان کے اعضا یخ ہو چکے تھے ... انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایسی یخ بستہ حالت میں زندگی سب سے پہلے کس عضو سے پھوٹتی ہے۔ احیائے زندگی کا وعدہ مردہ لاش سے کیوں کیا جاتا ہے ...

وہ اپنے ... نی کو کھنگال رہے تھے۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے لاشے سے سوئیاں نکال رہے تھے۔

وہ اپنی زندگی کے سٹوپا سے نکل کر باہر کی کھلی فضا میں آ بیٹھے تھے اور جو

چیز سب سے پہلے انہیں نظر آئی تھی وہ ایک شنکر چور ناگ تھا۔ جس کے ماتھے پر گائے کے کھر کا سا سفید نشان نہیں تھا۔ یہ شنکر چور برگد کے پیڑ پر چڑھا دھوپ سینک رہا تھا اور وہ ایسے گوکھرے اور ایسے کوڑیالے کا کوئی منتر نہ جانتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مالدیوی سپیرے ایسے سانپ کو پکڑنے کے لئے گروہ کی صورت میں نکلتے ہیں۔ . . . مدن بہت دور رہ گیا تھا۔ اور وہ پھنکارتے سانپ سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

جب سورج کی پہلی کرنیں کھڑکی میں داخل ہوئیں تو وہ مختلف بنکوں کی کاپیاں، پے ان سلپیں، اور چیک بکس سامنے لئے بیٹھے تھے۔ . . . انہیں بس اب ایک ہی منتر یاد رہ گیا تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک عورت تھی جس کو اپنے شوہر سے بدرجۂ غایت محبت تھی، لیکن شوہر کو نہایت نفرت، ہر طرح کی تدبیریں کیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی۔ اس نے سنا کہ مدینہ منورہ میں ایک عورت بڑی ساحرہ ہے۔ ناچار اس کے پاس گئی۔ اور اپنا درد دل ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ اچھا میں تجھے سلطان الساحرین کے پاس لے چلتی ہوں وہ کچھ علاج معقول کرے گا۔ رات کے وقت دونوں مدینہ طیبہ سے باہر نکلیں۔ دیکھا کہ دو جانور سیاہ رنگ گدھے کے برابر کھڑے ہیں، دونوں سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ آناً فاناً میں ملک عراق کے اندر چاہ بابل کے کنارے جا اتریں، جہاں

ہاروت ماروت آویختہ ہیں۔ وہ ساحرہ کنویں کے اندر گئی اور اپنے ساتھ والی کی سفارش کی۔ وہ دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور کہا کہ بلا ۔۔۔ عورت گئی اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ پہلے تو اس کو سمجھایا کہ تو جادو نہ سیکھ۔ اہل اسلام کو یہ بات زیبا نہیں۔ مگر اس عورت نے اصرار کیا۔ ہاروت و ماروت نے کہا خیر تیری خوشی۔ باہر ایک تنور ہے جا اور اس میں پیشاب کر! وہ عورت گئی اور یونہی بیٹھ کر چلی آئی۔ پیشاب نہ کیا۔ واپس آئی تو پوچھا کہ کیا دیکھا۔ اس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے کہا معلوم ہوتا ہے تو نے پیشاب نہیں کیا۔ پھر جا اور پیشاب کر!

اس نے دوسری بار بھی ایسا ہی کیا۔ تب فرشتوں نے کہا کہ جب تک پیشاب نہ کرے گی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ ناچار تیسری بار اس نے پیشاب کیا اور دیکھا کہ ایک سفید چیز جسم کے اندر سے نکلی اور ایک سیاہ چیز داخل ہو گئی۔ ان سے کیفیت بیان کی تو کہا جا اب تو پوری ساحرہ ہو گئی۔ جس طرح گئی تھیں اسی طرح رخصت ہو کر واپس چلیں۔ لیکن اس عورت کا تردد نہ گیا۔ پہلی ساحرہ نے پوچھا کہ اب کس لئے پریشان ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ کو تشفی و اطمینان کیا خاک ہو نہ کوئی منتر نہ پڑھنت نہ تعلیم و تلقین۔ میں تو جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہوں۔ اس نے کہا کہ یہاں پڑھنے پڑھانے کی کچھ حاجت نہیں۔ شاید تجھ کو اپنی سحر آموزی پر یقین نہیں ہوا۔ ذرا اس درخت کی طرف جو سامنے ہے بنظرِ غضب دیکھ۔ اس نے جو دیکھا تو درخت فی الفور خشک ہو گیا۔ پھر کہا کہ اب بنظرِ رحمت دیکھ۔ رحمت کی نظر

ڈالی تو معاً ہی سرسبز ہو گیا۔ کہا کہ اب بھی تجھے یقین آیا یا نہیں۔ بس تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ جو چاہے گی وہ وہ ہو جائے گا۔ تب اس عورت کو اطمینان ہو گیا۔ گھر میں آئی۔ شوہر کو بنظرِ محبت دیکھا اسی دم مطیع فرمان ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ اس زمانے میں وہ کالی چیز سونے کی بن چکی ہے جس کے تن کے اندر یہ روپہلی چیز داخل ہو جائے وہی ساحر اور اگر وہ ارادہ کرے تو ہر شخص اس کا مطیع فرمان بھی ہو جاتا ہے۔ ملک صاحب نے بھی نہ کوئی منتر جنتر پڑھے نہ پڑھنت نہ تعلیم و تلقین۔۔۔۔ بس کالی ساحر ہو گئے۔

رفتہ رفتہ ان کی ساحری کے چرچے کالج کے لیڈیز روم میں پہنچے۔

ایک روز جب ڈمپل اور رشو کالج نہ آئی تھیں تو چائے کا ڑے سامنے سجا کر سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں نے خوب خوب بخیے ادھیڑے۔

"ڈمپل کی صحبت میں بالکل ڈمپل جیسی ہو گئی ہے۔" گلنار نے کہا۔

"وہی لباس وہی بول چال۔۔۔" ظ نے کہا۔

"کرسمس کی چھٹیوں تک بالکل خیر تھی۔ یہ کچھ سکستھ ایئر ہی موافق نہیں آیا انہیں"

"خدا قسم دیکھ کر شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہی لڑکی ہے۔" طیبہ بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو یہ سکستھ ایئر کا اثر ہے سارا۔۔۔"

"ڈمپل کا بھی اثر ہے وہ تو بارود ہے پورا۔"

"بیچاری کی ماں بہاولپور میں سمجھتی ہو گی کہ بیٹی صاحبہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں یہاں

فیشن کا مکتب کھلا ہے۔" ط نے کہا۔

"یہ باہر کی لڑکیوں کو پر بھی زیادہ لگ جاتے ہیں لاہور والیوں کی نسبت۔"

"میں تو حیران ہوں کہ آخر اتنے مہنگے کپڑے آتے کہاں سے ہوں گے؟"

"سنا ہے کہ اس کے انکل بہت امیر ہیں۔" طیبہ نے روشنی ڈالی۔

"کونسے انکل؟" گلنار نے سوال کیا۔

"وہ اس دن نہیں آئے تھے سیاہ مرسڈیز میں... بالکل قائداعظم کی طرح رعب والے، ویسا ہی قد..."

"ہائے اللہ! کاش ہمارا بھی کوئی انکل اتنا امیر ہوتا!" ظ بولی۔

"ہائے کاش!" ط نے کہا۔

"واقعی..." گلنار بولی۔

"اور کیا۔ ہائے کاش!" طیبہ سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

رشو پر تبصرہ بہت جلد اپنے حالات کا تبصرہ بن گیا۔ اور ان کو بھول گیا کہ رشو کو لاہور نے کس قدر ملوث کر دیا ہے۔

لیکن ظفر کی حالت اس پن ڈبے جیسی ہو چکی تھی جسے یکدم معلوم ہو کہ وہ دمے کا مریض ہے۔ اور اب پانی میں اترنا اس کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ اپنے باپ سے کیا ہوا عہد اسے قبر کی سل بن کر دباتا تھا۔ ادھر رشو قوس قزح کی طرح رنگین ہو چکی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس تبدیلی پر متفکر ہوتا۔ چین بجبین ہوتا لیکن ظفر

ان لوگوں میں سے تھا جو ہر جذبے میں شدت کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ تن من دھن سے رشو کا ہو چکا تھا۔ بار بار اپنا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچتا تھا کہ اب وہ زندگی بھر رشو کا رہے گا۔ اور کوئی چیز، کوئی واقعہ، کوئی فعل اس کے جذبات میں کمی واقع نہ کر سکے گا۔

کسی بڑی امریکن کار کی پچھلی بتیوں جیسی عینکیں چہرے پر لگائے ٹیڈی پیسے جتنی باریک ہیلوں والے جوتے پہنے چست قمیص میں جب وہ چینی عورتوں کی طرح چلتی آتی تو ظفر کا دل یکدم بند ہو جاتا۔ خدا جانے یہ رشو کا رعب حسن تھا جو جلاپا کر خیرہ کن ہو چکا تھا یا اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ تھا کہ ظفر نے ایک بار بھی رشو سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

کالج میں وہ رشو اور ڈمپل کے عین پیچھے بیٹھنے کا عادی تھا۔ یہی گھنٹے جو وہ کلاس میں ان کی پشت پر بیٹھ کر گذارتا اس کا سرمایہ حیات تھے۔ اپنے آپ پر ایک پابندی لگانے سے اس میں ایک طرح کی صبر آزما قناعت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ رشو کو خط تو نہ لکھ سکتا تھا۔ اس سے بات نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس خوشبو میں سانس تو لے سکتا تھا جو رشو سے اٹھتی تھی۔ وہ ان بالوں کو تو دیکھ سکتا تھا جو سر پر بناتے ہوئے بڑے سے جوڑے میں سے نکل کر گردن پر آ لٹکتے تھے۔ وہ ان کندھوں پر تو نگاہیں مرکوز کر سکتا تھا۔ جو کھلے گلے سے نظر آتے تھے۔ جو سنگ مرمر کی طرح سفید اور ہاتھی دانت کی طرح چکنے تھے۔

رفتہ رفتہ ظفر کو اپنی قناعت سے اپنے ضبط سے پیار ہونے لگا۔

وہ کالج کی رشو کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر تیسری منزل میں پہنچتا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر سوچتا . . . . صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔

صرف امتحانوں تک ہی کی تو شرط ہے۔

اور وہ کو ہٹ دھرمی سے نہیں سر جھکا کر اپنی خواہشیں منوانا چاہتیں۔ اولاد وہی حلالی ہے جو والدین سے لڑ جھگڑ کر اپنی منزل کی طرف نہ بڑھے بلکہ اپنی سعادتمندی سے اپنی فرمانبرداری سے انہیں بھی شریک سفر کرے۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف ایک بچھو کا ڈنگ چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس بچھو کے ڈنگ پر اپنی سعادت مندی اپنی فرمانبرداری اپنی شرافت کا ڈھکنا لگاتے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ایک حصّہ . . . اس کے اندر اس کی انا کا ایک ہزارواں ٹکڑا اپنے باپ سے نفرت کرتا ہے۔

جوانی کی محبت کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ اور وہ ہے بسنت کا زرد رنگ !
یہ زرد رنگ کبھی زعفرانی ہو جاتا ہے اور کبھی کیسری۔ لیکن بنیاد اس کی ہمیشہ زرد رنگ پر ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو جانے والے سرسوں کے پھولوں کی طرح شگفتہ مگر زرد رہتے ہیں۔ ان کی بہار املتاش کے پھولوں کی طرح گرمیوں کی خاموش دوپہروں میں کوئل کی کوک سے جاگتی ہے۔ وہ لیموں کے عطر کی طرح زرد، چکنے اور ہلدی رنگے ہوتے ہیں اور ان کا نفسِ مضمون بڑا بے رونق ہوتا ہے۔ لکھنوی کی کتابت کی مانند . . .

جوانی میں محبت میں اندر اور باہر کا ایک رنگ ہوتا ہے . . . جون کی دھوپ کا زرد رنگ . . . . سہل انگار اس دھوپ سے ڈر کر ماں باپ کی چھاؤں میں جا بیٹھتے ہیں لیکن ظفر سہل انگار نہ تھا۔ اس کے اردگرد ایک دن کے چوزے کی زردی کھنڈی تھی اور وہ اکیلا ہی اپنی محبت کے یرقان میں مبتلا چلا جا رہا تھا۔ نہ اس نے رشو سے رحم کی التجا کی نہ اس نے اپنے باپ سے وعدہ توڑ ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا وہ تو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب بیج خود سیاہ مٹی کا سینہ چیر کر باہر آنکلتا ہے وہ تو اس لمحے کا منتظر تھا جب رشو کو خود چل کر اس کے پاس آنا تھا۔

تب سے تک ساری کائنات زرد تھی اور وہ گیروا رنگا لباس پہنے کپل وستو کے سدھارتھ کی طرح زرد زندگی بسر کر رہا تھا۔ کالج سے گھر اور گھر سے کالج . . . . ان دو جگہوں سے تھک کر کبھی کبھار وہ ہوسٹل میں غازی کے پاس چلا جاتا۔ اس لئے نہیں کہ غازی اس کا دوست تھا بلکہ صرف اس لئے کہ غازی بھی اس کی طرح ایک زرد جزیرے میں رہتا تھا۔

سب سے پہلے غازی نے ہی ظفر کو بتایا کہ ملک صاحب کی کار میں اس نے رشو اور ڈمپل کو شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔ یہ اطلاع اس نے کمال سادگی سے دی تھی . . .

"مبارک ہو یار ظفر" غازی نے کہا۔

"کیسی مبارک؟"

"ہمیں تو گلنار نصیب نہیں ہوگی لیکن تمہارا تو کام بن گیا"

"کیسا کام ؟ کیا کہہ رہے ہو ؟ . ."

"اب ہم سے چھپا رہے ہو ۔ یہ اچھی بات نہیں ہے ۔ ہم تو تمہیں گلنار کے کوٹھے پر لے گئے اور تم ہم سے اپنے تعلقات چھپا رہے ہو۔"

"کیسے تعلقات ؟ کس کے تعلقات ؟"

"تمہاری کار میں پرسوں یعنی بروز جمعرات شام کو ساڑھے سات بجے انارکلی میں کون تھا"

"کون تھا ؟"

"اب اس قدر بھولے بھی نہ بنو ۔ میں بھلا کسی کو بتا تھوڑی دوں گا . . ."

"کمال کر رہے ہو ۔ اگر کوئی تھا تو مجھے معلوم نہیں"

کچھ محجوب کچھ پریشان ہو کر غازی نے کہا ۔

"بھئی میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے بخشی مارکیٹ کے اندر جہاں بچوں کے کھلونوں کی دوکانیں ہیں عین وہاں تمہاری کار کھڑی تھی ۔ ڈمپل اور رشو پیچھے بیٹھی ڈگڈگیاں بٹن خرید رہی تھیں امرا کی خواتین کی طرح . . ."

"ڈمپل اور رشو ! ہماری کار میں ؟"

"تمہاری کار کا نمبر ستتر باسٹھ ہے ناں . . ."

"یہی نمبر ہے۔"

"تو پھر۔۔۔ وہی کار تھی اور وہی دونوں تھیں۔"

"اور ساتھ کون تھا؟"

"ملک صاحب تھے۔۔۔ تمہارے آباجی۔ تو بھلا میں انہیں نہیں پہچانتا۔ ہر ملک کی وہی صورت ہوتی ہے۔ کیا میرے آباجی کیا تمہارے آباجی۔ وہی کھنچے ہوئے جبڑے وہی بے مہر یونانی چہرہ۔ وہی قد۔"

ظفر خاموش ہو گیا۔ اس کے ارد گرد کی فضا گہری لسبنتی ہو گئی۔

"تم چپ کیوں ہو گئے۔۔۔" غازی نے سوال کیا۔

"بس ایسے ہی سوچ رہا ہوں۔"

"یعنی چہ۔"

"تمہارے اور گلنار کی بابت۔"

غازی نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"ہمارے متعلق سوچنا چھوڑ دو۔"

"کیوں؟"

"ہماری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔"

"ہو چکا ہے؟ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"کچھ باتیں بتانے سے انکی تکلیف کم نہیں ہوتی۔۔۔"

"پھر بھی۔"